ڈاکٹر فوزیہ اسلم

استاد شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

عبدالستار ملک

ریسرچ سکالر، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اردو رسم الخط میں تبدیلی کے مباحث

Language is a source of expression and communication for philosophy, culture and knowledge. Languages serve this obligation through script. Urdu script has been derived from Arabic-Persian script, which merged into this after additions and alterations.For this adoption of Urdu script, various suggestions and recommendations have been made. Once Roman, while at other times, Devanagriwas recommended, whereas conflicts for the implementation of Nasakh and Nastaliqscripts were also there.

تہذیب کی ترقی کے ساتھ انسان نے اپنے جذبات و خیالات کی ترسیل کے لیے فنِ تحریر ایجاد کیا۔ رسم الخط اس فنِ تحریر کی بنیاد ہے۔ کسی بھی زبان کی آواز کو قلم بند کرنے کے لیے کچھ علامات مقرر کی جاتی ہیں، جنھیں حروف کہتے ہیں اور جب باقاعدہ اصول کے مطابق ان حروف کی ترتیب و تشکیل ہوتی ہے تو اسے رسم الخط کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک بولی اُسی وقت زبان کے منصب پر فائز ہو سکتی ہے جب وہ ایک رسم الخط کی حامل ہو۔ زبان اور رسم الخط کا رشتہ جسم و روح کا رشتہ ہے۔ ایک معیاری رسم الخط سے ہی کسی زبان کے استحکام اور ترقی سے وابستہ ہے۔ زبان کسی قوم کے فکر و فلسفہ، تہذیب و ثقافت اور علم و فن کے اظہار کا وسیلہ اور ابلاغ کا ذریعہ ہے۔ زبان یہ فریضہ رسم الخط کے سہارے انجام دیتی ہے۔

رشید حسن خاں لکھتے ہیں: ''رسم الخط کسی زبان کو لکھنے کی معیاری صورت کا نام ہے۔''[۱] ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق: ''رسم الخط سے مراد وہ نقوش و علامات ہیں جنھیں حروف کا نام دیا جاتا ہے اور جن کی مدد سے کسی زبان کی تحریری صورت متعین ہوتی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زبان کی تحریری صورت کا نام رسم الخط ہے۔''[۲] ڈاکٹر رام آسرا رازؔ کے بقول ''کسی زبان میں مستعمل تمام آوازوں کو ایک رائج معیاری صورت میں لکھنے کے طریقے کو رسم الخط سے موسوم کیا جاتا ہے[۳] جبکہ ڈاکٹر سہیل بخاری کے مطابق: ''رسم الخط مختلف آوازوں کی تحریری علامتوں کا نظام ہے۔''[۴]

مندرجہ بالا تعریفوں کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسم الخط انسانی آوازوں کو محفوظ بنانے اور قلمبند کرنے کے لیے تحریری علامتوں کا ایک باقاعدہ نظام ہے۔ جس کی ہر علامت آواز کی ایک اکائی کی نمائندہ ہوتی ہے۔

اردو رسم الخط کی تاریخ:

اُردو رسم الخط، عربی و فارسی رسم الخط سے ماخوذ ہے جسے مقامی ضروریات اور آوازوں کی مناسبت سے ترمیم و اضافہ کے بعد اختیار کیا گیا۔ موجودہ رسم الخط کی تشکیل نے بتدریج ارتقا کی منازل طے کیں۔ تاریخ میں سب سے پہلے تصویری رسم الخط کا سراغ ملتا

ہے ۔آثار قدیمہ کے ماہرین کے مطابق وادیٔ دجلہ وفرات او روادیٔ نیل یعنی عراق ومصر تہذیب وتمدن کے قدیم ترین گہوارے ہیں۔ دونوں ملکوں میں کم وبیش چار ہزار قبل مسیح تحریر کا طریقہ ایجاد ہو چکا تھا۔

بابل میں رائج طریقہ تحریر کو خط مسماری ، پیکاری یا میخی (Cuneiform Script)اور مصری طریقہ تحریر کو خطِ ہیروغولیفی (Heieroglypluy) کہتے ہیں ۔[۵] اس کے بعد زبان کی آوازوں کے لیے حروف کے تعین کا دور آیا ۔ان خطوط میں آرامی کنعانی ، آرامی فینقی ،عبرانی مسند حمیری ، یونانی ، پہلوی ، سریانی ،نبطی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔پروفیسر سید محمد سلیم آرامی خط کو ام الخطو ط قرار دیتے ہیں ۔

> بابل اور مصر کے درمیان جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی کنارے پر ایک شہر کنعان ، جبرون الخلیل ہے یہاں آرامی نسل کی ایک شاخ آباد تھی۔ یہ فخر اس نسل کو حاصل ہے کہ تین ہزار قبل مسیح میں اس نے حلق سے نکلنے والی آوازوں کے لیے نقوش متعین کر لیے ۔[۶]

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے خط فینقی کو عربی رسم الخط کا ماخذ قرار دیا ہے [۷]۔ خطۂ فینقہ شام اور فلسطین کے قریب ہے۔ پروفیسر سید محمد سلیم نے فینقی کو آرامی کی شاخ بتاتے ہوئے حاشیہ میں صراحت کی ہے کہ ’’مغربی مؤرخین فینقیوں کو قدیم مانتے ہیں اور آرامی کو متاخر مانتے ہیں ، میں نے قرآن کا اتباع کیا ہے ۔جس کا بیان ہے کہ عاد ارم قدیم ترین قوم تھی‘‘۔[۸] ان کے مطابق ’’آریہ نسل کے اس کارنامے کو نہ ماننا یورپ کا نسلی تعصب ہے حالانکہ مورخ کبیر ٹائن بی اس کو تسلیم کرتا ہے ---حروف کے نام بھی سامی الاصل ہیں ۔‘‘[۹]

شیخ ممتاز حسین جونپوری کے خیال میں: ’’خط کوفی کی ایجاد چوتھی صدی عیسوی میں نبطی خط اور خط سیریاک یا سطرنجیلی سے ہوئی ---حرب بن امیہ کوفہ سے یہ خط سیکھ کر آئے ، اس لیے عرب میں اس کا نام خط کوفی پڑا۔‘‘[۱۰]

حجاز مقدس میں زیادہ تر یہی رسم الخط رائج تھا ، اس لیے قرآن مجید اسی میں لکھا گیا اور سرکارِ دو عالم ؐ نے مختلف سرداروں اور بادشاہوں سے اسی خط میں مراسلت فرمائی ۔ابتدا میں خط کوفی پر نقطے اور اعراب نہیں تھے ’’تقریباً ۵۰ھ میں ابو لاسود دوئلی نے نقطے ایجاد کیے مگر یہ نقطے بجائے اعراب کے استعمال ہوتے تھے۔‘‘[۱۱] جب عجمی مسلمانوں کو قرأتِ قرآنی میں مشکلات پیش آنے لگیں تو ’’خلیفہ عبدالملک بن مروان کے زمانے میں نصر بن عاصم نے ۶۵ھ میں حجاج بن یوسف کے حکم پر منقوط حروف پر سیاہ اور اعراب کے لیے قرمزی رنگ کے نقطوں کا استعمال کیا۔‘‘[۱۲] بالآخر ’’خلیل بن احمد فراہیدی (۱۷۰ھ) نے موجود اعراب وضع کیے ،جس کے بعد تحریر کا پڑھنا آسان ہو گیا ۔‘‘[۱۳]

عربی رسم الخط کا تیسرا دور ابو علی محمد بن علی بن حسن بن عبداللہ ملقب با بن مقلہ جیسی نابغۂ روزگار شخصیت سے شروع ہوتا ہے ’’اس نے خط کوفی سے ۳۱۰ھ/۹۲۲ء میں خط نسخ ایجاد کیا۔ اس کے علاوہ پانچ خط: خط محقق، خط ریحان ، خط ثلث ،خط توقیع اور خط رقاع وضع کیے۔‘‘[۱۴]

ابن مقلہ کے بعد ''ابن ابواب (۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء) اور یاقوت **المستعصمی** (۶۹۸ھ/۱۲۲۹ء) نے خط نسخ کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔''[۱۵] اس کے بعد فارسی رسم الخط کا دور آتا ہے۔ چنانچہ ''ایک عرصے کے بعد حسن فارسی نے فارسی زبان کی تمام ضروریات کو پیش نظر رکھ کر خط رقاع اور توقیع کی آمیزش سے خطِ تعلیق وضع کیا۔''[۱۶]

اس سے اگلا زمانہ عروس الخطوط کا ہے۔ پروفیسر سید محمد سلیم کے مطابق: ''میر علی تبریزی نے امیر تیمور گورگانی (۸۰۷ھ/۱۴۰۵ء) کے عہدِ حکومت میں خط نسخ اور خط تعلیق کو ملا کر خطِ نستعلیق ایجاد کیا۔''[۱۷] جبکہ مغنی تبسم کے خیال میں: ''اس خط کو میر علی تبریزی نے ترقی دی اور پھر عماد الحسن قزوینی نے کمال پر پہنچایا۔''[۱۸] عموی طور پر میر علی تبریزی کو خطِ نستعلیق کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس خط کا چلن میر علی تبریزی سے پہلے ہو چکا تھا۔ ابوالفضل آئینِ اکبری میں اس امر کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''یہ روایت صحیح نہیں کیونکہ اس سے پیشتر بھی اس خط میں چند رسالے دیکھے گئے ہیں۔''[۱۹] لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ میر علی تبریزی نے اس خط کے قواعد مرتب کر کے مصلحِ اول کا کردار ادا کیا۔

خطِ نستعلیق اہلِ عجم کی نفاست، حسن پرستی اور جدت پسند طبیعت کا مظہر ہے۔ خطِ نستعلیق خط نسخ کی نسبت رواں اور جاذب نظر ہے۔ اس کے دائروں کی گولائیوں اور کشش کی پیوند کاری میں جاذبیت اور تناسب ہے۔ حروف کی ساخت، نشست اور ان کے جوڑوں کے بندھن، نوکوں اور پلکوں میں خاص حسن ہے، جس کی بنا پر یہ رسم خط خطاطی کی حدود سے نکل کر نقاشی و مصوری کے دائرے میں داخل ہو گیا اور عروس الخطوط کے نام سے معنون ہوا۔

اگرچہ نستعلیق بہت خوب صورت خط ہے لیکن اس کی نزاکت کی وجہ سے لکھنے میں دیر لگتی ہے، اس لیے دفتری ضروریات کے لیے خط شکستہ وضع کیا گیا۔'' حاکم ہرات مرتضیٰ قلی خاں شاملو نے ۱۰۰۰ھ میں نستعلیق و تعلیق کو ملا کر (بعض نستعلیق و ثلث بتاتے ہیں) ایک نیا خط وضع کیا جو خط شکستہ کے نام سے مشہور ہوا۔''[۲۰] اس خط کی ایجاد کا مقصد ہی زود نویسی تھا۔ اس کے بعد'' مرتضیٰ قلی کے میر منشی محمد شفیع نے خط شکستہ اور نستعلیق سے (بعض ریحان کہتے ہیں) ایک نیا خط ایجاد کیا۔ جسے شکست آمیز یا شفیعہ کہتے ہیں۔''[۲۱] جس میں شکستہ کی نسبت حسن ہے۔ خط شکستہ کو گھسیٹ لکھائی بھی کہتے ہیں۔ اگرچہ خط شکستہ کا رواج نہیں رہا لیکن اب بھی محکمہ مال اور کچہری کی تحریروں میں کسی حد تک مستعمل ہے۔

اردو رسم الخط کے محاسن و معائب:

اردو رسم الخط کے خصائص و نقائص کا موازنہ کرنے سے پہلے ایک معیاری رسم الخط کا تعین ضروری ہے۔

پروفیسر محمد معین الدین دردائی کے مطابق ''کسی رسم الخط کی اچھائی اور برائی کو دو طریقوں سے پرکھا جاسکتا ہے۔ (۱) بلحاظ خوبصورتی (۲) بلحاظ فوائد''[۲۲] پروفیسر سید محمد سلیم نے رسم الخط کی تین بڑی خوبیاں گنوائی ہیں۔ ''(۱) آسان خوانی (۲) آسان نویسی (۳) خوش نمائی۔''[۲۳] سید قدرت نقوی نے ایک معیاری رسم الخط کے درج ذیل خصائص بیان کیے ہیں: ''(۱) ہر مفرد آواز کے اظہار کے لیے ایک مفرد علامت (حرف) ہو (۲) حروف اصوت کی صحیح نمائندگی کریں (۳) کم سے کم حروفِ تہجی ہوں ۔۴۔ جو کچھ لکھا جائے وہی پڑھا جائے۔''[۲۴]

ڈاکٹر گیان چند کے مطابق رسم الخط کے تین استعمال ہیں:''(۱)ہاتھ سے لکھنے کے لیے (۲)ٹائپ اور چھاپے کے لیے (۳) پڑھنے کے لیے ۔''[۲۵]

مندرجہ بالا بیانات سے ایک معیاری رسم الخط کے خدو خال متعین کیے جاسکتے ہیں ۔لیکن ایک نکتہ کی تصریح لازمی ہے کہ یہ تمام خصائص ایک ایسے رسم الخط کے لیے ضروری ہیں جسے اختیار کیا جا رہا ہو ۔جبکہ پہلے سے موجود رسم الخط تہذیبی و ثقافتی اساسیات کا امین اور تاریخی وعلمی روایات کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہرقوم کو اپنے رسم الخط سے قلبی اور جذباتی لگاؤ ہوتا ہے اور وہ اسے ترک کرنے کے لیے تیارنہیں ہوتی۔

لسانی ماہرین نے اردو رسم الخط کے مختلف خصائص کا ذکر کیا ہے ۔جس کا خلاصہ درج ذیل ہے ۔

۱۔ اردو رسم الخط اپنی ترکیبی خصوصیات کی بنا پر مختصر نویسی یعنی شارٹ ہینڈ ہے۔اس اتصالی خوبی کی وجہ سے اکثر الفاظ بیک جنبش قلم لکھے جاسکتے ہیں اور بار بار قلم اٹھانا نہیں پڑتا جیسا کہ ناگری ،رومن وغیرہ میں ہوتا ہے ۔یہ جگہ بھی کم گھیرتا ہے ،جس کے سبب تحریر و طباعت میں وقت اور اخراجات کی بچت ہوتی ہے ۔

۲۔ بہت سے حروف ہم شکل اور باہم مشابہ ہیں ۔جن میں نقطوں یا علامات کا خفیف سا فرق ہے ۔صرف ایک تہائی بنیادی حروف سیکھ لیں تو باقی حروف کی شناخت اورلکھائی آسان ہو جاتی ہے ۔

۳۔ یہ رسم الخط خوشنما اورمختصر ہونے کی وجہ سے نظر کی تسکین کا باعث بنتا ہے ۔اس کی اتصالی خاصیت کی بدولت ایک نظر میں پورے جملے کو پڑھا جاسکتا ہے ۔اس طرح عبارت خوانی میں سہولت رہتی ہے ۔ یہی جاذبیت اور اختصار اس کی مقبولیت کی دلیل ہے ۔دیکھنے میں بھی اردو تحریر بہت خوشنما ہے ۔یہاں تک کہ اردو خطاطی مصوری کی حدوں کو چھونے لگتی ہے ۔

۴۔ اس رسم الخط میں دونوں طرح کے اعراب ہیں ۔چار حروف علت ا ، و، ی، ے اور علامتی اعراب ۔یہ بنیادی مصوتے کافی حد تک متصل اعراب کا کام بھی کرتے ہیں اس لیے علامتی اعراب کے بغیر خاصی حد تک عبارت درست پڑھی جا سکتی ہے ۔''اردو رسم الخط کفایت حرفی کی اچھی مثال پیش کرتا ہے ---ہم بجائے اعراب کے عموماً اعراب کے صفریہ تصور سے کام لیتے ہیں اور عام طور پر چلن کی بنا پر ہمیں لفظ کے صحیح تلفظ میں دقت نہیں ہوتی ۔''[۲۶] اور جہاں تک تلفظ کا سوال ہے یہ اعراب ممکن حد تک درست تلفظ کے ضامن ہیں ۔

۵۔ ساقطے (Elisions Silents)زیادہ نہیں ،ساقط الصوت حروف صرف چار ہیں ۔'' تین مصوتے ا، و، ی اور ایک مصمتہ ل ''[۲۷]،جو بعض تراکیب میں نہیں پڑھے جاتے جبکہ دوسری زبانوں بالخصوص یورپی زبانوں میں ساقطے عام ہیں۔

۶۔ ''اردو میں حروف ہجا متغیرات الصوت نہیں ہیں ۔اس کے برعکس ہندی ، انگریزی ،فرنچ ، جرمن ، روسی ، ہسپانوی ، میں ایک حرف کئی کئی آوازیں دیتا ہے ۔''[۲۸]

۷۔ حروف تہجی ریاضیاتی اصول پر ہیں ۔''ریاضیات کے بنیادی اصول پانچ ہیں :(۱)نقطہ(۲)خط یا لکیر (۳) زاویہ(۴)دائرہ

(۵) پیائش یا ساخت۔"[۲۹] نیز"لفظ کی ابتدا حرکت اعرابی سے اور خاتمہ سکون پر ہوتا ہے۔ یہ امر طبعی کے عین مطابق ہے۔"[۳۰]

۹۔ ادغام کا عمل بھی اردو کی خاصیت ہے۔جو"اعراب تشدید یعنی مرکب علامت مصوتہ کے ذریعے ہوتا ہے،جس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ تحریروکتابت میں حروف علت یا صحیح کی کثرت اور تکرار کا عیب نہیں پیدا ہوتا۔"[۳۱] جبکہ یورپی زبانوں میں ادغام کی بجائے تکرارِحروف کا عیب پایا جاتا ہے۔

۱۰۔ اردو رسم الخط کی کتابت میں خطوط اور دائرے دوسرے رسم الخطوط کی نسبت کم ہیں مثلاً اگر ہم ناگری اور رومن کے ساتھ اُردو رسم الخط کا موازنہ کریں تو حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے

۱۱۔ اس خط کی ایک بڑی خاصیت یہ ہے کہ خوش قسمتی سے پاکستان کی تمام زبانوں کا رسم الخط یہی ہے۔جس کی وجہ سے اردو پڑھنے اور لکھنے میں آسانی رہتی ہے۔

۱۲۔ اردو رسم الخط ایک آفاقی خط ہے۔ بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:

> "ہمارے رسم الخط کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہماری ضرورتوں کا ساتھ دینے کے علاوہ یہ پاکستان ، ایران ،افغانستان ،شام ،عراق ،مصر ،سعودی عرب وغیرہ بیسیوں ایشیائی ممالک سے ہمارے تہذیبی روابط کی بنیاد مضبوط کرنے کا کام دیتا ہے۔"[۳۲]

ایک اہم بات یہ ہے کہ یورپی اور دوسرے ممالک میں بھی جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں اور قرآن پاک پڑھا جاتا ہے۔وہاں تک یہ رسم الخط ہمارے روابط کو استحکام بخشتا ہے۔

۱۳۔ یہ جامع الاصوات رسم الخط ہے۔ دنیا کی تقریباً بڑی بڑی زبانوں کی تمام آوازیں اس میں شامل ہیں۔اس لیے اردو بولنے والا تمام بڑی زبانوں کو ان کے تلفظ اور لہجے کے مطابق ادا کر سکتا ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔متعدد ماہرین نے اُردو رسم الخط کی فنی ،املائی اور صوتی مشکلات کے تناظر میں اردو رسم الخط کے نقائص گنوائے ہیں۔ چونکہ بہت سے ماہرین کے اعتراضات یکساں ہیں۔اس لیے سب کا اندراج تکرارِ محض ہے۔ لہذا ان اعتراضات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ اُردو حروفِ تہجی کی تعداد دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔اس لیے اس کا سیکھنا بہت مشکل ہے۔ نیز نقطوں کی بھرمار ہے۔

۲۔ حروفِ تہجی کی ترتیب صوتی نہیں ہے۔

۳۔ حروفِ تہجی کے نام بھی غیر صوتی ہیں۔حرف وصوت میں کوئی مطابقت نہیں۔

۴۔ ایک آواز کے لیے کئی کئی حروف ہیں۔ان مشابہ الصوت حروف کی وجہ سے املا میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔

۵۔ نستعلیق میں شوشے، گوشے، کونے، جوڑ، دائرے اور حروف کی کرسی ونشست طباعت تحریر میں مسائل پیدا کرتی ہیں۔ اس لیے کئی ماہرین نے حروف کی فنی اور تشکیل ساخت میں ترمیمیں تجویز کی ہیں۔

۶۔ اُردو کے حروف ترکیب واتصال کے وقت کئی شکلیں بدلتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس رسم الخط میں مہارت حاصل کرنا دشوار ہے۔

۷۔ مستقل اعراب نہ ہونے کی وجہ سے الفاظ کے تلفظ اور املا میں سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور قاری اور لکھاری کی مشکلات بڑھ جاتی ہیں۔

۸۔ اُردو رسم الخط میں ساقطے زیادہ ہیں۔ بہت سے حروف لکھے تو جاتے ہیں لیکن آواز نہیں دیتے۔ مثلاً واؤ معدولہ اور حروفِ شمسی وقمری وغیرہ۔

ماہرین زبان وادب نے اِن تمام اعتراضات کے مدلل اور اطمینان بخش جواب دیے اور اُردو رسم الخط کا مدلل دفاع کیا۔ اِن ماہرین میں ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر مسعود حسن رضوی اَدیب، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر سید محمد سلیم، ڈاکٹر شوکت سبزواری، پروفیسر طاہر فاروقی، پروفیسر محمد معین دردائی، ڈاکٹر ابومحمد سحر، سید قدرت نقوی، شمس الرحمٰن فاروقی، محمد نعیم خیالی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر رؤف پاریکھ جیسی علمی شخصیات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

رسم الخط میں تبدیلی واصلاح کے مباحث عموماً تین خطوط پر استوار ہیں: (۱)صوتیات (۲)املا (۳) طباعت۔

ڈاکٹر نصیر احمد خاں کے مطابق:

> اردو رسم الخط پر بحیثیت مجموعی اب تک جو تحریریں سامنے آئی ہیں انہیں پانچ حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے: (۱)اردو رسم الخط بدل دینے کا مشورہ (۲) زبان کے صوتی نظام کے حوالے سے اردو حروف کا تجزیاتی مطالعہ (۳)اردو رسم الخط سیکھنے اور سکھانے سے متعلق اصولوں اور قاعدوں کی بحث (۴) رسم الخط کی کمزوریوں اور خامیوں کے پیش نظر ان کی اصلاح سے متعلق تجاویز (۵)اردو املا کے مسائل۔[۳۳]

اردو رسم الخط پر نہ صرف اعتراضات کیے گئے بلکہ اس کی کمزوریاں اور خامیاں گنوا کر اسے بدلنے کی بھی تجاویز اور سفارشات پیش کی گئیں۔

اُردو رسم الخط کی بقا اور تحفظ کا مسئلہ اُردو زبان کی بقا اور ترویج وارتقا کا مسئلہ رہا ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں جب انگریزوں نے برصغیر پر قبضہ کیا تو انھوں نے یہاں کی رابطہ زبان کو اس کا رسم الخط سیکھنے کی مشقت اٹھائے بغیر رومن رسم الخط کے ذریعے لکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ فوج میں رومن رسم الخط ہی استعمال کیا گیا۔ نیز مشنری اداروں نے رومن رسم الخط میں اپنی کتابیں شائع کیں۔ فوج میں یہ تجربہ تو کسی حد تک کامیاب رہا لیکن عوام نے اِس تبدیلی کو قبول نہ کیا اور مشنری اداروں کو بھی اپنی کتابیں اُردو میں چھاپنا پڑیں۔ تاہم انگریزی کی عظمت کے زیرِ اثر کئی ماہرینِ لسانیات رومن رسم الخط اختیار کرنے کی تجاویز دیتے رہے اور یہ سلسلہ آزادی کے بعد بھی ماضی قریب تک جاری رہا۔ فورٹ ولیم کالج میں للو لال جی کی تصنیف ''پریم ساگر'' کی اشاعت کے بعد پورے برصغیر

میں تمام زبانوں کے لیے ناگری رسم الخط کے نفاذ کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ یو پی اور پنجاب میں یہ مطالبات نہایت شدت سے پیش کیے گئے اور حکومت نے کسی حد تک اِن کو پورا بھی کیا۔جس کے جواب میں اہلِ اُردو کی طرف سے سخت ردِعمل کا اظہار کیا گیا۔ درحقیقت قیامِ پاکستان کے اسباب کا ایک بڑا عنصر ہی رسم الخط کی تبدیلی اور ہندی کے بطورِقومی زبان نفاذ کا مطالبہ تھا۔سیاسی تحریکوں سے ہٹ کرفنی بنیادوں پر بھی ماہرین لسانیات نے ناگری رسم الخط کے نفاذ کی ضرورت و اہمیت واضح کی اور نفاذ کے حق میں دلائل دیے ۔ اِس سے اگلا مرحلہ نسخ و نستعلیق کا جھگڑا ہے۔زمانی اعتبار سے سب سے پہلے رومن اُردو رسم الخط کا تنازع شروع ہوتا ہے ۔

رومن رسم الخط :

یہ زمانے کا دستور ہے کہ فاتح قوم ہمیشہ اپنے فلسفہ وتہذیب کومفتوح قوم پر مسلط کرنے کی کوشش کرتی ہے۔اس مقصد کے لیے سب سے موثر ہتھیار زبان ہے۔ جس کے بغیر کسی قوم کے فلسفہ وتہذیب کو سمجھنا ناممکن ہے ۔جس کے چھین لینے سے ایک قوم اپنی تاریخ وفلسفہ سے بیگانہ اوراپنی تہذیب سے نا آشنا ہوجاتی ہے۔ زبان کے ڈھانچے میں رسم الخط روح کی حیثیت رکھتا ہے،جس کے بغیر زبان ایک بے جان لاشہ ہے۔ ہندوستان پر تسلط کے بعد انگریزوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے یہاں کی Lingua Franca کے عربی رسم الخط کو رومن رسم الخط میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اس کی تین بڑی وجوہات تھیں:

۱۔ وہ اِس رسم الخط اورحروفِ تہجی سے نابلد تھے ۔

۲۔ اِس رسم الخط کی سمت دائیں سے بائیں تھی۔

۳۔ اس کا ترکیبی طریقہ ان کے لیے نامانوس تھا۔

چنانچہ عیسائی مبلغوں نے بھی انجیل مقدس اور مذہبی لٹریچر کا رومن رسم الخط (اُردو) میں ترجمہ کرکے اشاعت کی اورفوج میں بھی رومن رسم الخط رائج کیا گیا۔فورٹ ولیم کالج نے بھی انگریزوں کے لیے کئی کتابیں رومن رسم الخط میں شائع کیں۔

رومن رسم الخط کے حق میں کئی دلائل دیے گئے مثلاً

۱۔ اگر رومن رسم الخط اختیار کیا گیا تو زبان کے سیکھنے میں آسانی ہوگی۔ ترکیبی انداز سے نجات مل جائے گی اور اُردو املا آسان ہوجائے گا۔

۲۔ طباعت کے مسائل حل ہوجائیں گے ۔

۳۔ بین الاقوامی طور پر ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ روابط کو استحکام ملے گا۔

۴۔ چونکہ رومن رسم الخط کی حامل زبانیں علم وفن کی بلندیوں کو چھورہی ہیں۔ اس لیے اُردو کے بھی علم وادبی ذخیرے میں بے پناہ اضافہ ہوگا اور اُردوبھی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہونے لگے گی۔

اُردو کے لیے رومن رسم الخط کاسب سے پہلے استعمال گلکرسٹ کی ’’انگلش اینڈ ہندوستانی ڈکشنری‘‘ میں ہوا۔ اس کا

پہلا ایڈیشن ۱۷۸۶ء میں اور دوسرا ۱۷۹۸ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔[۳۴] اس کے بعد دوسری اہم کوشش سرگریرسن کی ہے۔ جنھوں نے اپنی معرکہ آرا تصنیف'' ہندوستان کا لسانی جائزہ'' Linguistic Survy of India کی جلد نمبر 9 کے حصہ اول میں ہندوستانی آوازوں کو رومن حروف سے ظاہر کیا۔ ۱۹۱۲ء میں ایتھنز میں منعقدہ مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کے موقع پر اُردو اور ہندی کی آوازوں کو رومن رسم الخط میں ڈھالنے کے لیے ایک سکیم منظور کی گئی۔ جس کا مقصد اُردو اور ہندی میں ٹائپ رائٹر کے مسئلے سے نبرد آزما ہونا تھا۔[۳۵] ۱۹۳۹ء میں سجاد مرزا نے رومن رسم الخط کے لیے ایک نئی سکیم تجویز کی۔[۳۶] ۱۹۴۹ء میں پروفیسر ہارون خان شیروانی نے ایک کتابچے میں اُردوو ہندی رومن رسم الخط کے موازنے کے بعد رومن رسم الخط کے حق میں فیصلہ دیا اور اس کے لیے سکیم پیش کی۔[۳۷]

۱۹۴۷ء میں سجاد مرزا نے انجمن ترقی اُردو، حیدر آباد کی توجہ بھی رومن رسم الخط کے احیا کی طرف دلائی۔ چنانچہ اُردو زبان کے صحیح تلفظ کے اعتبار سے رومن حروف کی شکلیں اور ان کی قدریں متعین کرنے کے لیے انجمن نے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ جس کے داعی سجاد مرزا اور ارکان ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، پروفیسر نعیم الرحمٰن اور پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی تھے۔ اِس دوران میں برصغیر کی تقسیم کا عمل شروع ہو گیا۔ اس لیے کمیٹی اپنی کاروائی نہ کر سکی۔

تین سال بعد جب حالات معمول پر آئے تو ۱۹۵۰ میں ہندوستان میں اس مسئلے پر از سرِ نو توجہ دی گئی۔ انجمن ترقی اُردو حیدر آباد نے اس مقصد کے لیے ایک نئی کمیٹی قائم کی جس کے مستقل اراکین میں ڈاکٹر جعفر حسن، پروفیسر عبدالقادر، ڈاکٹر یزدانی، پروفیسر حبیب الرحمٰن، سجاد مرزا اور پروفیسر ہارون خان یزدانی شامل تھے۔ علاوہ ازیں نواب سعید جنگ بہادر، نواب احمد جنگ بہادر، ساجد علی صاحب سے بھی مشورہ طلب کیا جاتا رہا۔[۳۸]

ہندوستان کے ساتھ پاکستان میں بھی رومن رسم الخط اختیار کرنے کے مباحث جاری رہے۔ ۱۹۶۱ء میں شان الحق حقی نے اُردو کے لیے رومن رسم الخط کی ایک سکیم تیار کی۔[۳۹] ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اس سکیم پر اعتراضات کرتے ہوئے نئی تجاویز دیں۔[۴۰] شان الحق حقی کے مجوزہ رومن رسم الخط اور اس پر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی تنقید پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند نے اپنی جانب سے ایک نئی سکیم صوتیاتی ترتیب کے مطابق تجویز کی۔ جو'' اُردو نامہ'' شمارہ ۱۸ اپریل تا جون ۱۹۶۲ء ص ۵۷۔۴۷ پر شائع ہوئی۔ جو ترمیم و اضافہ کے بعد لسانی مطالعے میں بھی شائع ہوئی۔[۴۱] اِسی دوران امریکی ماہر لسانیات محمد عبدالرحمٰن بارکر نے اُردو کے لیے ایک صوتی رسم الخط تیار کیا۔[۴۲]

۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اُردو رسم الخط کے رومن حروف و نشانات مقرر کیے۔[۴۳] ڈاکٹر محبوب عالم خان نے ۱۹۷۶ء میں اُردو کے صوتی نظام پر تفصیل سے بحث کر کے اُردو کے لیے صوتیاتی رسم الخط تجویز کیا۔[۴۴]

اِن سکیموں کو دیکھا جائے تو ہر پیش کار نے نئی اور دوسروں سے الگ علامات و نشانات تجویز کیں اور نیا رومن سکرپٹ معرضِ وجود میں آ گیا۔ سچ ہے کوئی دوسرا رسم الخط ایک زبان کی تمام آوازوں اور لہجوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

گارسیں دتاسی نے درست کہا تھا:

اُردو کو لاطینی رسم الخط میں لکھنا مفید نہ ہوگا۔ اس واسطے کہ لاطینی حروف کے ساتھ مزید ایسے حروف کی ضرورت ہوگی جن پر خصوصی علامتیں لگی ہوں ۔ یہ ایک نیا نظامِ تہجی ہوگا اور ان کا سیکھنا ہندی کے حروفِ تہجی سے بھی زیادہ دشوار ہوگا۔ [۴۵]

جہاں تک صوتی رسم الخط کا تعلق ہے ۔ یہ روزمرہ استعمال کی چیز نہیں ،اسے لغات میں تلفظ ولہجہ کی درستی یا غیرملکیوں کو اُردو سکھانے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے ۔

پاکستان میں رومن رسم الخط کا یہ مسئلہ اُس وقت زیادہ شدت اختیار کیا گیا جب سابق صدر محمد ایوب خان نے پاکستان کی تمام زبانوں کے لیے رومن رسم الخط کی تجویز ۳۱ دسمبر ۱۹۵۸ء کو کابینہ کے اجلاس میں پیش کی ۔[۴۶] اس کے ساتھ ایوب خان نے ۳۰ دسمبر ۱۹۵۸ء کو قومی تعلیم کے سلسلے میں ایک کمیشن مقرر کیا، جس نے آٹھ مہینے کے بعد رپورٹ تیار کی اور تعلیمی اصلاحات کے علاوہ رومن رسم الخط کو اختیار کرنے کے لیے تجاویز دیں۔[۴۷]

چند سرکاری حلقوں کے سوا عوام نے شدید ردِعمل کا اظہار کیا اور محبانِ اردو صدارتی حکم کے خلاف سینہ سپر ہوگئے ۔انجمن ترویج اردو (نیازمندانِ سید عبداللہ کی قائم کردہ)اور دوسری علمی ادبی انجمنوں کی طرف سے رومن رسم الخط کے خلاف شدید ردِعمل اور مخالفت دیکھ کر حکومت کو بھی اپنا ارادہ تبدیل کرنا پڑا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں :

لاہور میں رسم الخط کے مسئلے پر ایک دو جلسے ہوئے جن میں جسٹس رحمٰن، مولوی صلاح الدین احمد، ڈاکٹر وحید، چودھری نذیر احمد خان نے تقریریں کر کے حکومت پر واضح کیا کہ ہم قرآنی رسم الخط کو کسی حالت میں نہ چھوڑیں گے اور مولوی صلاح الدین احمد نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ قرآنی رسم الخط کو تبدیل کرنے والے پہلے ہماری لاشوں سے گزریں!اِس تنبیہ سے ایوب خان لرز اُٹھا اور ارادہ ترک کردیا۔خدا اسے بخشے اور مولوی صلاح الدین احمد کو اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ [۴۸]

محبانِ اُردو کی اس طویل اور صبر آزما تحریک کے باوجود ابھی تک رومن رسم الخط کی وکالت کرنے والے موجود ہیں اور اب رومن رسم الخط کی مدافعت اور وکالت میں ایک نکتہ کا اضافہ ہوگیا ہے کہ اس طرح اُردو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی زبان بن جائے گی۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ اس ذہنیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

آج سے چالیس پچاس سال قبل چلائی جانے والی بدنیتی پر مبنی اِس مہم کے اس نئے جنم پر حیرت ہوتی ہے کیونکہ اس کی تجہیز وتکفین کو بھی کوئی نصف صدی گزر چکی ہے اور لوگ اسے بھول بھال گئے ہیں۔ ایسے موقع پر یہ شبہات پیدا ہونا فطری امر ہے کہ اب یہ مہم کس کے اشارے پر چلائی جارہی ہے ۔[۴۹]

رومن رسم الخط کے خلاف لکھنے والے ماہرین زبان وادب کی ایک طویل فہرست ہے۔اختصار کی خاطر چند حوالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔مولوی عبدالقدوس ہاشمی نے رومن رسمِ خط کی مخالفت میں انتہائی مدلل اور شاندار مضمون لکھا۔ جو''رسالہ اُردو میں (جنوری ۱۹۴۹ء)میں شائع ہوا۔ یہی مضمون بعد میں معمولی ترمیم کے ساتھ رسالہ فاران میں شائع ہوا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۸ء میں جب

اُردو کی بجائے رومن رسم الخط اختیار کرنے کی تجویز پیش کی گئی تو اس مضمون کو بعض اضافوں کے ساتھ ۵۲صفحات پرمشتمل ایک کتابی شکل میں شائع کردیا گیا۔[۵۰] اس میں وہ لکھتے ہیں:

انگریزی زبان میں جتنی آوازیں ہیں، اُردو زبان میں اس سے کہیں زیادہ آوازیں پائی جاتی ہیں۔ انگریزی میں حروفِ صحیح کل اکیس ۲۱ ہیں مگر آوازیں چونتیس (۳۴) ہیں، باقی تیرہ (۱۳) آوازوں کے لیے مختلف قسم کے مرکبات سے کام لیاجاتا ہے مثلاً Ch چ، Sh ش، Th تھ یا۔د، وغیرہ اور پانچ حروفِ علت ہیں جن سے سولہ(۱۶) آوازیں پیدا کی جاتی ہیں۔ ان کا کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہے بلکہ تلفظ کے بارے میں صرف سماعت پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔۔۔انگریزی کے تین حروف X,C اور V کی ہمیں ضرورت نہیں لیکن چ کی آواز کے لیے C کو رکھنا پڑے گا۔ اس طرح کل ۲۴ حروف ہم کو ملیں گے۔ ان میں غ، خ، ت،ش،ڑ اور د کے لیے چھ حروف کا اور اضافہ فرمایئے، کل ۳۰ حروف ہوتے ہیں۔ ان ۳۰ حروف سے اُردو زبان کی تمام آوازیں ادا نہیں ہوسکتیں۔ اُردوزبان میں ۸۲ آوازیں ہیں جو ہمارے موجودہ رسم الخط سے مفرد ومرکب صورتوں میں ادا کی جاتی ہیں اور بعض میں حرکات سے کام لیا جا تا ہے۔ مفرد جیسے با،مرکب جیسے بھا اور حرکات سے جیسے آ، حرکات کے لیے رومن تحریر کے نشانات کے بغیر کام نہیں چل سکتا اور اس صورت میں ہم اُردوحروف پر اعراب لگانے سے کم دقت میں نہیں پڑتے۔۔۔اگر رسم الخط بدل کر ٹھیک اسی طرح لکھا گیا جیسا کہ آج رومن تحریر میں لکھا جاتا ہے تو موجودہ رسم الخط کی بہ نسبت زیادہ مشتبہ اور دقت طلب رہے گا۔۔۔دوسری شکل یہ ہے کہ حروف وآواز میں تطابق ہم خود قائم کریں۔ کسی دوسری زبان کی آوازوں کا خیال ہی نہ آنے دیں تو اس کے لیے لاطینی رسم الخط کی ہی کیا تخصیص ہے۔[۵۱]

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مثال دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

مثلاً کوئی شخص جس نے رومن حروف سیکھ لیے ہوں، مگر نہ انگریزی زبان سے واقف ہو نہ اُردو سے، وہ اگر کسی عبارت میں Maze لکھا ہوا دیکھے تو وہ کسی طرح یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ اس کو میز پڑھنا چاہیے یا مزے۔ اسی طرح Mail کے بارے میں یہ طے نہیں کرسکتا کہ اس کو میل پڑھے یا مَیل۔ لیکن جو شخص یہ دونوں زبانیں جانتا ہو وہ اِن لفظوں کو انگریزی عبارت میں میز اور میل پڑھے گا اور اُردو عبارت میں مَزے اور مَیل۔۔۔ایسی ہی نہ معلوم کتنی دقتیں پیش آئیں گی ،جن کا حل زبان کے علم کے بغیر ممکن نہ ہوگا۔ پس یہ دعویٰ کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ رومن حرفوں کے ذریعے سے اِن حرفوں میں لکھی ہوئی تمام زبانوں کی عبارتیں پڑھی جاسکتی ہیں۔[۵۲]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری دقتِ نظر سے رومن رسم الخط کے نقائص اور دشواریوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

انگریزی زبان میں تو آوازوں کا کوئی نظام ہی نہیں ہے۔ نشانات کچھ ہیں، آوازیں کچھ نکلتی ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اس زبان کے املا (Spelling) اور تلفظ (Pronunciation) پر قابو پانا سخت مشکل ہوگا جب تک ہر لفظ کے معانی کے ساتھ اس کی املا اچھی طرح ذہن میں محفوظ نہ ہو، لکھنا مشکل ہوگا۔[۵۳]

انھوں نے اپنے موقف کی صداقت کو متعدد مثالوں سے ثابت کیا ہے۔ آج بھی گاہے گاہے رومن رسم الخط کی حمایت میں آوازیں سننے میں آتی ہیں ۔ ہر زبان کا منفرد مزاج ہوتا ہے اور اس کا رسم الخط اُس کے مزاج کا عکاس ہوتا ہے ۔ اِس لیے کسی زبان کے رسم الخط کو ترک کر کے دوسرا رسم الخط اختیار کرنا ایک غیر فطری امر ہے ۔نئی نسل اپنی تہذیب و تاریخ سے بیگانہ ہو جاتی ہے ۔تحریر کا مزاج بدل جاتا ہے اور الفاظ اپنی تاریخ سے کٹ کر بے جان ہو جاتے ہیں ۔

دیوناگری رسم الخط کا مسئلہ:

جہاں تک دیوناگری کے حوالے سے اُردو رسم الخط کے مسئلے کا تعلق ہے تو اِس مسئلے کی بنیاد فورٹ ولیم کالج میں پڑی۔اٹھارویں صدی تک اُردو ہندی کا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں للولال جی کی ''پریم ساگر'' نے دونوں زبانوں کے درمیان خلیج کی بنیاد رکھی۔ جس کے بعد دونوں کا الگ الگ سمتوں میں ارتقا شروع ہوا اور دو الگ لسانی اور ادبی روایتوں کی صورت بننے لگی۔ انگریزوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ہندو مسلم تفرقات کو لسانی بنیادوں پر ہوا دینے کی کوشش کی اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے فورٹ ولیم کالج میں گجرات کے ایک برہمن للولال جی کو اس اہم خدمت پر مامور کیا گیا۔ وہ دیوناگری اور فارسی رسم الخط دونوں سے آگاہ تھے۔اِس لیے یہ کام انھوں نے بہت احسن طریقے سے سرانجام دیا۔ ڈاکٹر رام آسرا رازؔ ہندی ادب کے مستند مؤرخ رام چندر شکل کی تحریر نقل کرتے ہیں:

> اگر للولال اُردو نہ جانتے ہوتے تو پریم ساگر سے عربی فارسی الفاظ دور رکھنے میں اتنے کامیاب نہ ہوتے جتنے وہ ہوئے۔ بہت سے عربی فارسی الفاظ بول چال کی زبان میں اتنے گھل مل گئے تھے کہ انھیں صرف سنسکرت ہندی جاننے والے کے لیے پہچاننا بھی مشکل تھا۔[۵۴]

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہندوستانی زبان کو ناگری رسم الخط میں عدالتوں اور حکومتی اداروں میں رائج کرنے کا مطالبہ زور پکڑتا گیا اور آخر کار یہ قضیہ تقسیمِ ہند پر منتج ہوا۔ اس طرح قیام پاکستان کا ایک اہم سبب اُردو زبان کی حفاظت اور نفاذ بھی تھا۔

اس قضیہ کے ساتھ یہ مطالبہ بھی زور پکڑتا گیا کہ ہندوستان کے اتحاد کی خاطر اُردو کا قرآنی اور عربی رسم الخط تبدیل کر کے دیوناگری میں لکھا جائے۔ جب یہ مباحث شروع ہوئے تو اُردو زبان کے ماہرین زبان و ادب نے بہت دقتِ نظری اور منطقی انداز میں اُردو رسم الخط کا دفاع کیا اور تمام فنی پہلوؤں اور قباحتوں کا تفصیلی جائزہ لے کر ثابت کیا کہ اُردو رسم الخط دیوناگری کی نسبت سہل اور بہتر ہے اور اُردو کا مروجہ رسم الخط ہی اس کے لیے موزوں ترین ہے۔ ان ماہرین میں عبدالقدوس ہاشمی، پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب، گیان چند ،قدرت نقوی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پروفیسر محمد معین دردائی، محمد الیاس برنی جیسی شخصیات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ایمپریل گزیٹیر نے ہندی کی تشکیل کے امر کو یوں بیان کیا ہے:

ہندوستانی کی قسم ہندی اس زمانے میں فورٹ ولیم کالج کے اساتذہ نے ایجاد کی۔ اس کا مقصد ہندوؤں کے لیے

ایک ہندوستانی زبان تیار کرنا تھا۔ اسے اُردو سے تمام عربی اور فارسی الفاظ کو نکال کر ان کی جگہ سنسکرت کے الفاظ لکھ کر تیار کیا گیا۔[۵۵]

دیوناگری رسمِ خط میں لکھے جانے والی ہندی کی اصلیت کی بابت ششی کنٹھ مشر اپنی تصنیف ''کھڑی بولی اندولن'' میں یوں رقم طراز ہیں:

للو لال جی جو جدید ہندی کی پہلی کتاب کے مصنف ہیں، برہمن تھے۔ انھوں نے ایک مصنوعی اسلوب ایجاد کیا، جس میں عربی وفارسی الفاظ کی جگہ سنسکرت اور برج بھاشا کے الفاظ قصداً رکھے گئے اور اسی ''پریم ساگر'' کے اسلوب کی لوگ تقلید کرنے لگے اور اسی اسلوب کو جدید ہندی سمجھنے لگے۔[۵٦]

اِن مباحث کے تجزیے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ فنی اعتبار سے ناگری رسمِ خط کو اُردو کا متبادل قرار دینے کا جواز نہیں بن سکتا۔ یہ مسئلہ خالصتاً سیاسی محرکات کا نتیجہ تھا۔ اگرچہ اُردو کا رسم الخط ہندوستان میں بھی تبدیل نہیں کیا جاسکا تاہم ہندوؤں نے دانستہ طور پر ہندی میں سنسکرت کے نامانوس اور متروک الفاظ بھر کر ہندی کے کینڈے کو اُردو سے الگ کرنے کی کوشش کی اور یہ کوشش تاحال جاری ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ہوسکتا ہے کہ یہ زبان بھی سنسکرت کی طرح عوام سے دور ہوکر محض ادب کی زبان بن کر رہ جائے کیونکہ ہندوستانی فلموں کے گیت اور مکالموں کی زبان اس حقیقت کی غماز ہے کہ عوام عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ ہندی اور اردواب دو آزاد مستقل بالذات زبانیں ہیں لیکن ان دونوں میں اس قدر اشتراک ہے کہ شاید ہی دنیا کی دو زبانوں میں ہو، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے الفاظ میں:

اس باہمی اشتراک کی وجہ سے موجودہ لسانی صورت حال کچھ اس طرح کی ہے کہ اگر ہندی اوراردو کو دو دائروں کی شکل میں ظاہر کیا جائے تو دونوں دائرے ایک دوسرے سے ملتے ہوئے نظر آئیں گے اوردونوں دائروں کا نصف سے زیادہ حصہ منطبق ہوتا ہوا معلوم ہوگا۔[۵۷]

نسخ اور نستعلیق کا جھگڑا:

رومن اورناگری رسم الخط کو اختیار کرنے کی تجاویز کے ساتھ نسخ ونستعلیق کا تنازع بھی مسلسل موضوعِ بحث رہا ہے اور ماہرین نے نسخ ونستعلیق کے حق میں اپنے اپنے دلائل سے اپنے مؤقف کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

نسخ ونستعلیق میں بنیادی فرق سادگی اورآرائش کا ہے۔ خطِ نسخ عربی مزاج کی سادگی کا آئینہ دار ہے اورنستعلیق ایرانی نفاست کا عکاس۔ نسخ کے دائروں میں چپٹا پَن، ہر جوڑ واضح اور قلم یکساں ہوتا ہے۔ جبکہ نستعلیق میں حروف کی کشش، شوشوں، جوڑ، پیوند اور دائروں کی پیائش وانداز میں تنوع ہوتا ہے۔ دائرے کہیں گول ہوں گے، کہیں بیضوی۔ اس تنوع کی وجہ سے حروف کی کرسی بدلتی رہتی ہے۔ نستعلیق میں قلم بار بار بدلتا ہے۔ کہیں پورا قلم ہوگا تو کہیں نصف اور کہیں اِس سے بھی کم۔ حروف کے سر، گردن اوردور (کشش) میں قلم کا پیمانہ مختلف ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک حرف کی مختلف حالتوں (ابتدائی، وسطی، آخری) میں قلم کی پیائش اور انداز مختلف ہوتا ہے۔

نستعلیق کی خوبصورتی اور جاذبیت کا راز یہ ہے کہ یہ دو خطوں نسخ (عربی) اور تعلیق (فارسی) کے ملاپ سے وجود پذیر ہوا۔خطِ نسخ عباسی دور میں ایجاد ہوا جبکہ تعلیق ایرانی کاتب حسن بن حسین علی کی ایجاد سمجھا جاتا ہے ۔یہ دسویں صدی عیسوی میں ترقی کر کے ایران کا مقبول خط بن گیا۔صفویں کے دور میں نستعلیق شاہی دربار میں استعمال ہونے والا مقبول خط تھا۔ چونکہ مغلوں کی درباری اور سرکاری زبان فارسی تھی، اِس لیے نستعلیق کو یہاں بھی اِتنی مقبولیت ہوئی کہ یہ شاہی خط وکتابت میں استعمال کیا جانے لگا۔نستعلیق کی ترقی وترویج میں ایرانی کاتبوں، میر عماد حسینی،مرزا بزرگ نوری، مشائخین قلم،مرزا جعفر تبریزی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آہستہ آہستہ نستعلیق فنونِ لطیفہ کا شاہکار بن گیا۔قرآن پاک کی آیات اور دیگر شہ پارے اِس میں لکھے جانے لگے۔ مقابلے کی فضا نے نستعلیق کو مزید نکھارا۔حکیم محمود علی خاں رقم طراز ہیں:

> اہل عجم ہمیشہ سے جدت پسند اور حسن پرست واقع ہوئے ہیں۔ جب اِن کو نسخ میں بھدا پن نظر آیا تو اِس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔ نسخ میں ہر دائرہ اول سے آخیر تک یکساں رہتا تھا اور حرفوں میں کسی قدر ناہمواری تھی ۔یعنی دائرے گول نہ تھے بلکہ نچلا حصہ چپٹا ہوتا تھا۔ جس میں کونے یا زاویے نکل آتے تھے ۔لہٰذا انھوں نے حروف میں نقاشی (شانِ مصوری) پیدا کی اور حروف کی نوکیں، گردنیں اور نیچے کا حصہ باریک کر دیا اور دائرے گول بنائے اور اِس کا نام نستعلیق قرار پایا۔۔نستعلیق کے حسنِ قبول کی بڑی دلیل یہ ہے کہ لفظِ نستعلیق سے متعدد محاورات ایجاد ہوئے جو زبان زد ہیں۔ [۵۸]

ڈاکٹر محمد صدیق شبلی لکھتے ہیں:

> خطِ نستعلیق کو اِس کی نفاست اور زیبائی کے سبب عروس الخطوط کہا جاتا ہے۔ اِس کے دائروں اور نیم دائروں کی گولائیاں،حروف کی ساخت اور ان کی نشست ،حروف کی کشش اور اُن کی پیوند کاری اور نقطوں کا استعمال اِس خط کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔ دیکھنے میں یہ خط بہت خوبصورت لگتا ہے۔ اِس میں لفظوں کا پھیلاؤ کم ہوتا ہے اور نظر اِس کو پڑھنے میں زیادہ دقت محسوس نہیں کرتی ۔[۵۹]

دنیا کا کوئی خط بھی ہر لحاظ سے کامل اور خامیوں سے مبرا نہیں ہے۔ اُردو نستعلیق میں بھی کچھ خامیاں ہیں۔ڈاکٹر سلیم فارانی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے مثلاً الفاظ میں اُردو حروف بہت شکلیں بدلتے ہیں۔حروف کی ابتدائی، درمیانی اور آخری صورتوں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔نستعلیق میں صرف ''ب'' کی چودہ شکلیں استعمال ہوتی ہیں۔ اِس بِنا پر اگر ہر حرف کی مختلف شکلوں کا حساب کیا جائے تو اُردو حروفِ تہجی کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے ۔اس کے علاوہ بے شمار شوشے وکونے وغیرہ ہیں۔ اور اِس سے اُردو ٹائپ اور طباعت کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔[۶۰] شان الحق حقی نے بھی حروف کی متنوع ترکیبی شکلوں کی وجہ سے نستعلیق پر اعتراض کیا ہے[۶۱]

پروفیسر محمد سجاد مرزا کے الفاظ میں :نستعلیق کی کمزوریاں یہ ہیں:

۱۔ حرف چھوٹے بڑے اور اونچے نیچے ہوتے ہیں۔ مثلاً الف کھڑا ہوتا ہے اور ب پڑی ہوئی ہوتی ہے۔ جیم کا دامن یا سین کا دائرہ ان دونوں سے نیچا ہوتا ہے ۔

۲۔ جب کوئی لفظ لکھا جاتا ہے تو حرف مل کر اپنی اصل شکل بالکل بدل کر کئی کئی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف چھوٹی بڑی ہوتی ہیں بلکہ ان کی کرسی یعنی اونچ نیچ میں اور زیادہ فرق ہوجاتا ہے۔ مثلاً عین کو لیجئے، لفظ عالم میں ع کا صرف سر ہے اور باقی غائب معلم میں ع کا سر ہی رہتا ہے اور نہ دامن بلکہ ایک نئی شکل ہوجاتی ہے۔ مربع لکھیے تو ع کی آخر میں ایک اور نئی شکل ہوجاتی ہے۔ مگر رقاع لکھیے تو اصلی شکل بدستور قائم رہتی ہے۔

۳۔ اس کے جوڑوں کی کرسیوں کے اختلاف کے علاوہ ایک اور دقت یہ ہے کہ اس کے جوڑ ایک ہی لفظ میں کہیں موٹے ہوتے ہیں اور کہیں پتلے اور باریک مثلاً لفظ مہتمی میں م سب سے اوپر ہے پھر ہ اس کے نیچے پھر دوسرا م اس کے نیچے پھر تیسرا م اس سے نیچے اور آخری حرف ی سب کے نیچے۔ گویا کہ ایک سیڑھی بن گئی ہے۔ اب مختلف جوڑوں اور ایک ہی حرف مثلاً م کے جوڑوں کو غور سے دیکھا جائے تو ثابت ہوگا کہ کوئی موٹا ہے اور کوئی پتلا اور باریک۔[۶۲]

ڈاکٹر نصیر احمد خاں لکھتے ہیں:

اُردو حروف عموماً لفظ میں اپنے ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ لفظ کے شروع، درمیان اور آخر میں یہ اضافے سرتاپا بدلی ہوئی اور کٹی پھٹی شکلوں کے علاوہ اکثر اپنی صورت میں بھی آتے ہیں۔ تحریر میں گرگٹ کی طرح بدلنے والے جو رنگ اِن حروف کے ہوسکتے ہیں، شاید کسی اور رسم الخط میں ممکن نہیں۔[۶۳]

ڈاکٹر سلیم فارانی رقم طراز ہیں:

ایرانی جو نستعلیق رسم الخط کے موجد تھے، تقاضائے وقت کے مطابق نستعلیق چھوڑ کر نسخ اختیار کر چکے ہیں۔ افغانستان بھی اِس کی طرف مائل ہے۔۔۔ اِس رسم الخط میں الفاظ ایک ہی کرسی پر لکھے جاتے ہیں اور اس کے اجزائے ترکیبی کی تعداد بھی زیادہ نہیں۔ ایک حرف کی دو تین صورتوں سے تمام قسم کے الفاظ کے ترکیبی کام لیے جاتے ہیں۔ اِس رسم الخط میں جوڑ بندوں کی دبازت بھی یکساں ہوتی ہے اور خوبصورتی میں بھی یہ خط نستعلیق کے مقابلے میں کم نہیں۔[۶۴]

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے طباعت کی دشواریوں کے پیشِ نظر نستعلیق کی بجائے نسخ کی حمایت کی ہے۔[۶۵]

رشید حسن خاں کے خیال میں:

نستعلیق اصل میں ایرانی صناعی، جمالیاتی ذوق، تراش خراش اور ظاہری آرائی کا آئینہ خانہ ہے۔ اِس خط میں اگر صورت پر سارا زور مرکوز ہوکر رہ گیا ہے اور نوک پلک اور نزاکت آبی نے اِس صورت آرائی کی تشکیل کی ہے تو جائے تعجب نہیں؛ یہ تو اِس تہذیب کا تقاضا تھا۔ نستعلیق کے دائروں اور کششوں میں ایسی نزاکت ہوتی ہے کہ قلم ذرا

سا اُچٹااور دائرہ بگڑا۔ کرسی ذرا سی بدلی اور حُسن غارت ہوا—— اِن صفات کی بنا پرلوہے کی مشین کے ناز اُٹھانا، نستعلیق کے بس کی بات نہیں۔ اِس کی نفاست اور تراش خراش اِس فولاد روشی کے متحمل ہوہی نہیں سکتی تھی۔ اِس بارِ امانت کو خطِ نسخ ہی اُٹھاسکتا تھا۔ ۔۔نستعلیق میں پورے لفظ کے اجزا اِس انداز سے باہم پیوست ہوتے ہیں کہ اُن کو ٹکڑوں میں تقسیم کرکے دوبارہ اُس طرح وصل دینا مشکل ہے۔ ٹائپ میں سارا کاروبار مختلف ٹکڑوں کومقررہ انداز سے جوڑنے پرمشتمل ہے اوراِس میں وہ چسپیدگی، وصل اورنوک پلک کی آبداری نہیں آ پاتی جوقلم کی جنبشوں سے وجود میں آتی ہے۔ ہاں پورے پورے لفظ ڈھال لیے جائیں تو اور بات ہے اور یہ ہونے سے رہا۔ آسمان کے تاروں کوکس نے گِنا ہے۔[٦٦]

حال میں بھی خط نسخ کی حمایت میں آوازیں سنائی دیتی ہیں۔جنوری ۲۰۰۸ء تخلیقی ادب کے شمارے میں محمد سلیمان اطہر/ڈاکٹرانوار احمد کامضمون شائع ہوا۔جس میں انھوں نے خطِ نسخ کی حمایت کی۔ [٦٧]

اُردو رسم الخط میں دونوں طرزِ تحریر مستعمل رہے ہیں۔آغاز ہی سے ہاتھ کی لکھائی کے لیے نستعلیق مقبول رہا۔ جبکہ طباعت کے لیے عام طورپرنسخ کو ترجیح دی گئی۔لیتھو اور آفسٹ لیتھوگرافی کی ایجاد کے بعد نستعلیق کی طباعت نے بھی خوب فروغ پایااور یہ تحریر کی دونوں روشیں متوازی چلتی رہیں۔ جس کی وجہ سے طرزِ تحریر میں دو انداز مستعمل ہوگئے اوردرس وتدریس میں بھی کسی معیاری خط کاتعین نہ ہوسکا۔قومی تعلیمی کمیشن (۱۹۵۹ء) اپنی رپورٹ میں نستعلیق کے نقائص بیان کیے۔ [٦٨] سابق صدر پاکستان محمد ایوب خان کے دور میں نسخ ونستعلیق کا جھگڑا عروج پر رہا کبھی کتابیں نسخ میں چھاپی گئیں تو کبھی نستعلیق میں ۔

اِن تمام اعتراضات کے باوجود نستعلیق کی کچھ ایسی خوبیاں ہیں کہ اِسے نسخ کے مقابلے میں حددرجہ مقبولیت حاصل ہے اورعوام اِسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔نستعلیق مطالعے کے اعتبار سے سہل اور جاذبِ نظر ہے۔نسخ کے مقابلے میں کم وقت صرف ہوتا ہے۔نسخ ایک تکنیکی رسم الخط ہے اوراِس کے حروف کی مختلف شکلیں متعین ہیں۔ اِس لیے پڑھنے میں دشواری محسوس نہیں ہوتی بشرطیکہ مشق بہم پہنچائی جائے لیکن ہاتھ کی تحریر میں طالب علم مہارت حاصل نہیں کرسکتے ۔نتیجتاً رفتارکم اورلکھائی خراب ہوتی ہے۔نستعلیق میں یہ آسانی ہے کہ یہ لکھنے میں رواں ہے ۔اِس میں الفاظ طول اُفقی انداز میں لکھے جاتے ہیں۔ الفاظ کی اشکال حد سے زیادہ پھیلی ہوتی ہیں اور نقطے وغیرہ کہیں بھی لکھے جاسکتے ہیں اورلکیریں بالکل سیدھی نہیں رکھنا پڑتی بلکہ رواں دواں انداز میں ہوتی ہیں۔

ٹائپ اور طباعت کی دشواریوں کے مدِ نظرنستعلیق کی جگہ نسخ کا مطالبہ کیا گیاتھا،جواصولاً اب اُردو آفسٹ ، نوری نستعلیق/ پاک نستعلیق/ تاج نستعلیق کے وجود میں آنے کے بعدختم ہوجاناچاہیے۔ وقت نے ثابت کردیاہے کہ رسم الخط کی اصلاح اورتبدیلی کی بجائے جدیدٹیکنالوجی سے کام لینے اورطباعت کے وسائل کوبہتر بنانے کی ضرورت تھی۔

اِس سارے پس منظر کے پیشِ نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بدقسمتی سے جوتوانائیاں رسمِ خط کے فروغ وترقی کے لیے صَرف ہوناچاہیے تھیں،وہ اِن مناظرانہ مباحث میں ضائع ہوتی رہیں اور اتفاق کی بجائے اختلاف کے ماحول سے فضا مکدر رہی ۔ دو صدیوں کے مباحث اور ردوقبول کے جھگڑوں کے بعدبھی معاملہ جوں کا توں ہے۔ اِن مباحث اور جھگڑوں کا باب بند ہوناچاہیے

اور اِفتراق وانتشار اور تردید واختلاف کی کیفیت سے نکل کر یکسوئی لگن اور ایثار کے ساتھ اُردو رسم الخط کے استحکام اور زبان کی ترقی کے لیے سعی ہونی چاہیے۔

حوالہ جات

۱۔ رشید حسن خاں، اُردو املا، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۲

۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو املا اور رسم الخط، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۷۷

۳۔ رام آسرا رازؔ، ڈاکٹر، اُردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ، راز اینڈ سنز، قدوائی نگر نئی دہلی، ۱۹۷۵ء، ص ۹۱۔۹۲

۴۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اُردو رسم الخط کے بنیادی مباحث، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۱۵

۵۔ سید محمد سلیم، پروفیسر، اُردو رسم الخط، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۱ء، ص ۱۴

۶۔ ایضاً، ص ۱۵

۷۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، جامع القواعد حصہ صرف، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۴۔۱۹۵

۸۔ سید محمد سلیم، پروفیسر، تاریخ خط وخطاطین، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۳۵

۹۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۰۔ شیخ ممتاز حسین جونپوری و محمد ایوب قادری، خط وخطاطی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۳۱

۱۱۔ محمد سجاد مرزا، پروفیسر، اُردو رسم الخط، مشمولہ، اُردو رسم الخط (انتخاب مقالات) مرتبہ شیما مجید، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص ۱۶۰

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۱۳۔ سید محمد سلیم، پروفیسر، اُردو رسم الخط، ص ۲۸

۱۴۔ جامع اُردو انسائیکلو پیڈیا، جلد ہشتم، فنونِ لطیفہ، مشمولہ اُردو دنیا، فروغِ اُردو کونسل (انڈیا)، اپریل ۲۰۰۵ء، ص ۴۷۔۴۸

۱۵۔ سید محمد سلیم، پروفیسر، اُردو رسم الخط، ص ۲۹

۱۶۔ محمد سجاد مرزا، پروفیسر، اُردو رسم الخط (مضمون)، مشمولہ، اُردو رسم الخط (انتخاب مقالات) مرتبہ شیما مجید، مقتدرہ، قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص ۱۶۲

۱۷۔ سید محمد سلیم، پروفیسر، اُردو رسم الخط، ص ۳۰

۱۸۔ مغنی تبسم، خط نستعلیق مطبوعہ ماہنامہ اخبارِ اُردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، مارچ ۲۰۰۶ء، ص ۸

۱۹۔ ابوالفضل، آئین اکبری (ترجمہ مولوی محمد فدا علی طالب)، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ندارد، ص ۱۸۹

۲۰۔ محمد اسحٰق صدیقی، {{رسم الخط، تاریخ اور فن کے آئینے میں}}، مشمولہ اُردو میں لسانیاتی تحقیق مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی، کوکل اینڈ کمپنی، بمبئی، ۱۹۷۱ء، ص ۳۷۷

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۷۷

۲۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو املا اور رسم الخط، ص ۷۰

۲۳۔ محمد معین دردائی، پروفیسر، لسانی مطالعے، مجلس دانشوراں، فیروز پور روڈ، لاہور،۱۹۷۰ء، ص۵۲

۲۴۔ سید محمد سلیم، پروفیسر، تاریخ خط وخطاطین، ص۷۹

۲۵۔ سید قدرت نقوی، مرتبہ، لسانی مقالات (حصہ اول) ،مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد،۱۹۸۸ء، ص۱۷۸

۲۶۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اُردو زبان اور لسانیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۲۰۰۷ء، ص۱۲۸

۲۷۔ خیالی، محمد نعیم اللہ، اُردو کی بین الاقوامی حیثیت، بریلی الیکٹرک پریس ،بریلی (انڈیا)،۱۹۷۲ء، ص۸۰

۲۸۔ ایضاً، ص ۸۵۔۸۶

۲۹۔ ایضاً، ص۶۵

۳۰۔ ایضاً، ص۶۸۔۶۹

۳۱۔ ایضاً، ص۷۶

۳۲۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اُردو زبان اور لسانیات، ص۱۱۲

۳۳۔ نصیر احمد خاں، اُردو لسانیات، اُردو محل پبلی کیشن، نئ دہلی، ۱۹۹۰ء، ص۲۳۷

۳۴۔ طارق عزیز ڈاکٹر، رسم الخط اور ٹائپ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص۳۲

۳۵۔ ایضاً، ص۳۴

۳۶۔ ایضاً، ص۳۵

37. H.K. Sherwani, Professor, SOME POINTS, for and against of Hindi,Urdu and Latin (Roman) scripts for the National Language of India, Hyderabad Decan, 1949.

۳۸۔ ہارون خان شیروانی ،پروفیسر، اُردو رسم الخط اور طباعت، اسلامک پبلی کیشنز ،حیدر آباد دکن، ۱۹۵۷ء ص ۳۷

۳۹۔ شان الحق حقی ڈاکٹر، اُردو الفاظ کی رومن املا، اُردو نامہ (سہ ماہی) شمارہ۴، بابت اپریل تا جون ۱۹۶۱ء

۴۰۔ عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر، اُردو الفاظ کی رومن املا، اُردو نامہ (سہ ماہی) شمارہ ۷، جنوری تا مارچ ۱۹۶۲ء ،ص۸۲۔۷۶

۴۱۔ گیان چند، ڈاکٹر، لسانی مطالعے ،ترقی اُردو بورڈ، مرکزی وزارتِ تعلیم ،حکومت ہند،۱۹۷۳ء، ص ۱۳۸۔۱۳۹

۴۲۔ محمد عبدالرحمٰن بارکر، پاکستان کے لیے رسم الخط، مطبوعہ نصرت (ہفت روزہ) ،لاہور، ۱۹اپریل ۱۹۶۱ء ص۴۱

۴۳۔ محمد دین تاثیر، ڈاکٹر ،نثر تاثیر، مرتبہ فیض احمد فیض، اُردو اکادمی ،بہاولپور،۱۹۶۳ء ،ص۲۸۔۲۹

۴۴۔ محبوب عالم خان، ڈاکٹر ،اُردو کا صوتی نظام ،مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص۳۱۔۳۴

۴۵۔ گارسین دتاسی ،بحوالہ ہندی اُردو تنازع از ڈاکٹر فرمان فتح پوری، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص۳۲۷

۴۶۔ محمد ایوب خان، جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص۱۴۰

۴۷۔ رپورٹ قومی تعلیمی کمیشن حکومت پاکستان، جنوری ،اگست ۱۹۵۹ء

۴۸۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر ،پاکستان میں اُردو کا مسئلہ (ایک تاریخی و تحقیقی مطالعہ) مکتبہ خیابان ادب ،لاہور ،۱۹۷۶ء ،ص ۵۷

۴۹۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، رومن اُردو کیوں؟، مطبوعہ اخبار اُردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، نومبر ۲۰۰۶، ص ۲۔۳

۵۰۔ طارق عزیز، ڈاکٹر، اُردو رسم الخط اور ٹائپ، ص ۷۶

۵۱۔ ایضا، ص ۷۶۔۷۸،

۵۲۔ مسعود حسن رضوی ادیب، اُردو رسم الخط کی علمی حیثیت ،مشمولہ اُردو میں لسانیاتی تحقیق مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی ،ص ۳۹۴۔۳۹۵

۵۳۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، تدریس اُردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۶۴۔۶۶

۵۴۔ راز، رام آسرا، ڈاکٹر، اُردو اور ہندی کالسانیاتی رشتہ، ص ۵۴۔۵۳

۵۵۔ بحوالہ شبیر احمد، اٹھارویں صدی کے ہندوستان کا لسانی جائزہ ،مشمولہ منتخابات اخبار اردو مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء ص ۴۶۷

۵۶۔ ششی کنٹھ مشر، بحوالہ اُردو سے ہندی تک، از ڈاکٹر عبدالودود، مجلس فکر و ادب ،کراچی، ۱۹۷۴ء، ص ۲۹

۵۷۔ گوپی چند نارنگ مرتب ،لغت نویسی کے مسائل (خصوصی اشاعت) مطبوعہ ماہنامہ کتاب نما جلد نمبر ۲۵ شمارہ نمبر ۱۹ ستمبر ۱۹۵۸ء، ص ۵۴

۵۸۔ حکیم محمود علی خان صاحب ماہر اکبرآبادی ،علم الحروف یا تحقیقات ماہر (حصہ اول)، دہلی، ۱۹۳۴ء، ص ۹۸۔۹۹

۵۹۔ محمد صدیق شبلی، ڈاکٹر، اُردو رسم الخط کا تحفظ، مطبوعہ ماہنامہ اخبارِ اُردو، مقتدرہ قومی زبان ،اسلام آباد، مئی ۲۰۰۰ء، ص ۲

۶۰۔ سلیم فارانی ،ڈاکٹر، اُردو زبان اور اُس کی تعلیم، ادارہ مطبوعاتِ فارانی ،لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۴۔۲۰۵

۶۱۔ شان الحق حقی، لسانی مسائل ولطائف، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء، ص ۱۸۔۱۹

۶۲۔ محمد سجاد مرزا، پروفیسر، اُردو رسم الخط (مختصر تاریخ معہ تجاویز اصلاح)، مشمولہ اُردو رسم الخط (انتخاب مقالات) مرتبہ شیما مجید، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص ۱۶۸

۶۳۔ نصیر احمد خان، ڈاکٹر، اُردو لسانیات، ص ۲۲۸

۶۴۔ سلیم فارانی، ڈاکٹر، اُردو زبان اور اُس کی تعلیم، ص ۲۱۰۔۲۱۱

۶۵۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ادب ولسانیات، اُردو اکیڈمی سندھ ،کراچی، ۱۹۷۰ء، ص ۳۴۰، ۳۵۲

۶۶۔ رشید حسن خاں، اُردو املا، ص ۴۹۳۔۴۹۴

۶۷۔ محمد سلیمان اطہر، اُردو قاعدہ اور اُردو املا (تحقیقی وتنقیدی جائزہ)، مطبوعہ تخلیقی ادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۲۱۰، ۲۲۹

68. Report of the COMMISSION ON NATIONAL EDUCATOIN, Governmnet of Pakistan, Ministry of Educaiton, January-August 1959, P.304.